اُردو مثنوی کا ارتقا

عبدالقادر سروری

ایجوکیشنل بُک ہاؤس ○ علی گڑھ

Scanned with CamScanner

اردو مثنوی کا ارتقاء

[جدید ایڈیشن]

پروفیسر عبدالقادر سروری

ایجوکیشنل بک ہاؤس

مسلم یونیورسٹی مارکیٹ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

ڈاکٹر خالد ندیم
شعبۂ اردو، سرگودھا یونیورسٹی، سرگودھا
موبائل: ۰۳۲۱۔۶۳۳۳۱۵۵
dr.khalidnadeem@gmail.com

جملہ حقوق محفوظ

ایڈیشن ---- 2010

قیمت ------ -/50

کتابت : ریاض احمد، الہ آباد

مطبع : ایم۔ اے۔ پرنٹرس دہلی

ایجوکیشنل بک ہاؤس

مسلم یونیورسٹی مارکیٹ علی گڈھ

۲۰۲۰۰۲

Scanned with CamScanner

۱

مثنوی کا مقام اصناف شعر میں

ہماری شاعری میں سب سے اہم صنف مثنوی کی ہے، کیوں کہ اس میں ایک وسیع مضمون اور مربوط خیال کے نشوونما کی گنجائش ہے۔ یہ صحیح ہے کہ شعر کی کوئی صنف بھی ہو، بذات خود غیر اہم نہیں سمجھی جا سکتی۔ اچھائی اور برائی صناع میں پیدا ہوتی ہے۔ ایک باکمال شاعر پیش پا افتادہ اصناف کو بھی اپنی وجدانی قابلیت کی دستیاری سے بلندیوں کی انتہا تک پہنچا سکتا ہے۔ اردو شاعری کی کچھ صنفیں جیسے غزل، قصیدہ اور رباعی بہت مقبول صنفیں رہی ہیں اور اچھے اور برے ہر طرح کے شعرا کی اتنے طویل عرصہ تک بطور خاص زیر مشق رہ چکی ہیں اور ان کے اصلی اور بنیادی موضوعات کے اتنے وسیع پہلو طبع آزمائی کے مرکز رہ چکے ہیں کہ اب ایک اعلیٰ صناع کے لئے بھی ان میں کمال پیدا کرنا، ذرا کٹھن ہی ہے۔ فکر بلند اور حسین اسالیب کے باوجود غزل کی صنف کے مخصوص موضوعات اور لوازم کی رعایت اور خود صنف کی شکل وصورت کی یکسانیت

جو غزل کا لازمہ ہے، پڑھنے والوں کے لئے کدورت کا سبب بن جاتی ہے۔

غزل گو شاعر، طبیعت کی انتہائی اپج کے باوجود غزل کے بنیادی عناصر اور خاص طور پر اس کے اصلاحی لوازم اور روایات کو ٹھکرا نہیں سکتا۔ اسی لئے نئے موضوعات پر طبع آزمائی کرتے ہوئے وہ استعارے سے کام لینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے مطالعہ کرنے والوں میں سے بہت کم اس کے اصلی مفہوم تک پہنچ سکتے ہیں، اور اکثر استعارے کو منزلِ مقصود تصور کر لیتے ہیں۔ اس سے پڑھنے والوں اور شاعر دونوں کا نقصان ہوتا ہے، لیکن یہ مجبوری ہے۔

قصیدے میں غزل کی وسعت بھی نہیں ہے اور شکل کی حد تک سوائے نسبتاً زیادہ طویل ہونے کے، تمام صوری خصوصیات میں قصیدہ غزل کے مشابہ ہے۔ اسی لئے غزل کے قارئین کے لئے قصیدہ شکل کے اعتبار سے کوئی نئی چیز نہیں معلوم ہوتی۔ یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ غزل کی شاعری ہو یا قصیدہ کی شاعری، شعری خیالات کے اظہار کے لئے اصناف اور اشکال ہیں، یہی ساری شاعری نہیں ہیں۔ ان میں جو کچھ کہا جا سکتا ہے، کہہ چکنے کے باوجود، اور کچھ کہنے کی ضرورت باقی رہتی ہے۔ اور "وسعت بیان کے لئے"، "ظرف تنگنائے غزل" کی شکایت کا لب پر آجانا ایک فطری بات ہے۔

ہماری شاعری پر یکسانیت اور روایت پرستی کے الزام کا ایک بڑا عنصر درحقیقت اصناف کی تحدید اور ان کی ضرورت سے زیادہ پابندی پر عائد ہوتا

ہے۔ اس قید نے ہماری زبان کے بعض اعلیٰ فن کارانہ قابلیتوں کو کبھی پوری طرح بروئے کار آنے نہیں دیا اور آج روشن خیال نقادوں کو ہمارے قدیم شعراء کے افکار، ایک ناقابلِ امتیاز اجزا کا ڈھیر نظر آرہے ہیں۔

مثنوی میں، کچھ تو اس وجہ سے کہ یہ صنف بہت زیادہ تختۂ مشق نہیں بنی، اور کچھ اس کی نوعی وسعت کے سبب بڑی گنجائش رہی اور شاید ہمیشہ رہے گی۔ یہ درست ہے کہ فن ابتدا میں ایمائی اور علامتی اختصار کا حامل ہوتا ہے اور انتہا پر بھی، لیکن محض علامتی اختصار ہی کو شاعری سمجھنا فکر انسانی کو بلاوجہ محدود کر دینا ہے۔ اسی لئے غزل کی علامتی شاعری کے بعد بھی، ذوقِ شعر کی تشنگی باقی رہتی ہے جو مربوط، خیالی، ایک معین مقصد کے تحت واقعات نفس الامری کے ترکیبی ارتقاء اور گوناگوں مظاہرِ فطرت کی نقاشی اور اجزائے کائنات کی شاعرانہ توضیح اور تشریح سے پوری ہو سکتی ہے اور ان کے لئے مثنوی بڑی سہولت بخش صنف ہے۔

قدیم مثنویوں میں کہنے کو تو ایک قصہ یعنی واقعات کا ایک گھڑا ہوا سلسلہ اور خیالی اور اکثر اوقات فوق فطری یا خلاف قیاس افسانہ ہو سکتا ہے، لیکن اس میں بھی واقعات کو جوڑنے، ان کو مربوط کرنے اور ایک مطلب خیز انجام تک پہنچانے یعنی قصہ کے واقعات کے ارتقاء میں حیات کے بہت سے حسین اور قبیح پہلو آجاتے ہیں۔ اسی میں ڈرامائی مواقع پیدا ہوتے ہیں، بیانیہ اور مرقع

نگاری کی شاعری کی توضیحات، طربیہ شاعری کی شگفتگی، حزنیہ شاعری کی اثرانگیزی رزمیہ اور قصیدے کا طمطراق، غزل کی گھلاوٹ، غرض سب کچھ اس میں سما سکتے ہیں۔ لیکن یہ اجزا اگر علٰحدہ علٰحدہ اور تنہا پیش کئے جائیں تو حافظے اور ذوق کے لئے شاید اتنے موثر نہ ثابت ہوں اور وہ دلکشی کا سامان نہ رکھ سکیں جتنے کے وہ ایک مکمل کارنامہ کے ترکیبی عناصر بن جانے کے بعد رکھ سکتے ہیں، جس طرح کہ تصویر کے انفرادی خاکے کے مقابلہ میں ایک ایسی تصویر زیادہ دلکشی رکھتی ہے جس میں ایک مکمل منظر اپنی تمام جزئیات کے ساتھ پیش کیا گیا ہو۔ یہ چھپی ہوئی بات نہیں ہے کہ ہماری زبان کے بعض ایسے شاعر جو صرف چند سو شعر کی صرف ایک مثنوی سرانجام کر سکے، ہزاروں اشعار کے دیوان رکھنے والے شاعروں کے مقابلہ میں بھی زیادہ ممتاز ہو گئے ہیں اور اہمیت کے مالک بن گئے ہیں۔

لیکن یہ بات ضرور ہے کہ مربوط خیالی، اطمینان قلب اور آسائش دماغ کی پیداوار ہے۔ جہاں یہ چیزیں مفقود ہوں شعرا کا ذہنی انتشار اظہار کے مناسب اور موزوں ذریعہ تلاش کر لیتا ہے۔ ایسے زمانہ میں جب کہ اطمینان قلب مفقود ہو، شاعر جو کچھ کہنا چاہتا ہے جلد کہنا چاہتا ہے اور مختصر کہنا چاہتا ہے۔ چونکہ لمحات فرصت اور اطمینان قلب کے دوام کا اس کو یقین نہیں ہوتا، اسی لئے وہ ہر موقع کو شاید آخری موقع سمجھتا ہے اور کسی طول طویل اور بسیط تجویز

میں پھنس کر اپنے کام کو ادھورا چھوڑ جانے کے اتفاقات کا خطرہ وہ قبول کرنا نہیں چاہتا۔ اس کے بڑے بوڑھے، رجعت پسند نقاد اپنی طویل اور شاید خوشحالی کی زندگی کو نظر میں رکھ کر اس کی جلد بازی کے خلاف جو چاہیں کہہ لیں لیکن وہ اپنی نفسی افتاد اور مقتضائے وقت کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔

ہماری شاعری پر کچھ عرصہ بظاہر خوشحالی کا بھی گذرا ہے۔ مثلاً دکن میں قرون وسطیٰ کی خود مختار سلطنتوں، بیجاپور اور گولکنڈے کا عہد، لکھنؤ میں آصف الدولہ اور ان کے جانشینوں کا زمانہ۔ یہ اردو شعرا کے لئے قدر دانی اور عروج کا زمانہ تھا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ لکھنؤ کا عہد سیاسی تنزل کا زمانہ بھی تھا۔ یہ مختصر سے خوشحالی کے دور دو تباہیوں کا وسط تھے۔ بیجاپور اور گولکنڈہ کی خود مختاری زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکی اور لکھنؤ کی آبادی دلی کے تباہی بردوش شعرا سے ہوئی۔ ان کی اولاد جو باپ دادا کی مصیبتوں سے ناواقف تھی اور جس کی آنکھ آصف الدولہ جیسے "لکھ لٹ" نواب اور ان کے جانشینوں کے زمانہ میں کھلی تھی، اس موقع سے فائدہ اٹھاتی اور فطرت کے اقتضا کے مطابق عمل کرنا چاہتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اردو میں چند طویل کارنامے، چند مثنویاں اور شاید بلند پایہ مثنویاں معرض وجود میں آگئیں۔

اس دور سے آگے بڑھ کر جب ہم دکن کے قدیم تر دور پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ خوشحالی اور سیاسی اور ادبی عروج کا زمانہ نظر آتا ہے۔ جس میں خاص طور یہ

بیجاپور اور گولکنڈہ کی خود مختار سلطنتوں کے سایہ عاطفت میں فکر و فن کو پنپنے کا موقع ملا۔ بہمنی سلطنت ایک کافی طویل عرصہ کے امن و امان اور خوشحالی کے دور کے بعد زوال پذیر ہوگئی تو اس کی خاک سے پانچ ریاستوں کی تعمیر ہوئی جن میں بیجاپور اور گولکنڈہ اردو ادب کی خدمت کے اعتبار سے خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان سلطنتوں نے بہمنی دور کی تمدن روایات کے نشو و نما کو جاری رکھا۔ اور اس طرح دس سے بارہویں صدی ہجری تک یہاں شائستگی، حسن کاری، ادب اور شاعری کا ارتقاء کم و بیش مسلسل رہا۔

بیجاپور اور گولکنڈہ کے حکمران علم و فضل، ادب، شاعری اور فنون لطیفہ کے نہ صرف بے مثل سرپرست تھے، بلکہ ان میں اکثر خود ادب، شعر اور فنون لطیفہ کا بلند پایہ ذوق بھی رکھتے تھے۔ اسی لئے ان سلطنتوں کے استحکام کے ساتھ ہی فضا میں علم و فن کے آثار جو تخم کی طرح بکھرے ہوئے تھے نشو و نما پانے لگے۔ اور تھوڑے عرصہ میں ان سلاطین کے دربار ارباب علم و فن اور خاص طور پر اردو شعراء کا قابل رشک مرکز بن گئے۔

اس عہد کے اردو کارناموں میں، امن و آسائش کی فکر اور فن کی اکثر خصوصیات موجود ہیں۔ اس طرح بیجاپور اور گولکنڈہ کے طول طویل ادبی کارنامے کوئی اتفاقی چیز نہیں سمجھے جا سکتے۔ بلکہ یہ ایک پر امن ماحول کا لازمی نتیجہ ہیں۔ اس ماحول نے قدیم شعراء کے حوصلوں کو ہمیشہ بلند رکھا۔ چنانچہ اس عہد کے اکثر

شعراء کے کارنامے مکمل اور مربوط تجویزوں اور سینکڑوں بلکہ ہزاروں اشعار کے وسیع سرمایہ پر مشتمل ہیں۔ ان کی تعداد بھی اتنی زیادہ ہے کہ اردو شاعری کے ارتقاء کے کسی اور عہد میں کم مل سکے گی۔

مثنوی اور غزل کا یہاں مقابلہ منظور نہیں۔ اسی طرح یہ سمجھنا بھی درست نہیں کہ غزل گو شعراء نے سالہا سال کی عرق ریزیوں کے بعد جو ضخیم دیوان چھوڑے ہیں، وہ کسی مثنوی نگار کے کارنامے کے مقابلہ میں کم درجہ ہیں۔ بلکہ اصل واقعہ یہ ہے کہ محض تغزل کو شاعری سمجھ لینا شعر کی وسعتوں کو نظر انداز کرنا اور دوسری اصناف پر ظلم کرنا ہے۔

غزل ہو یا رباعی، اپنی بہترین صورت میں بھی منفرد اور منتشر خیالات کا مجموعہ ہوتی ہے۔ ان اصناف میں جس طرح کے مضامین اور خیالات کے اظہار کی گنجائش ہے ان کے نبڑ جانے کے بعد بھی ذوق شعری کی تکمیل کے لئے کچھ اور کہنے کی ضرورت باقی رہتی ہے۔ ایک طویل، مربوط اور مکمل شعری کارنامہ کی تخلیق مثنوی ہی کی شکل میں بہ وجوہ احسن ہو سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کے کارنامے کی تکمیل میں زیادہ توجہ، محنت، فکر، ربط خیال اور احساس تناسب ترتیب اور تعمیر، صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ اس لئے جب ایک ہزار یا ڈیڑھ ہزار اشعار کی اچھی مثنوی تیار ہو جاتی ہے تو وہ ایک دس ہزار اچھے اشعار کے دیوان غزل کے مقابلہ میں بھی زیادہ مشہور اور

Scanned with CamScanner

مقبول ہو جاتی ہے۔

یہ محض خیال نہیں بلکہ واقعہ ہے۔ میر اثر کی مثنوی "خواب و خیال" چند سو شعر کا ایک متوسط درجہ کا کارنامہ ہے۔ لیکن اس کو علمی دنیا میں بہت سارے اساتذہ کے دیوانوں سے زیادہ اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔ حالاں کہ "خواب و خیال" تکمیل کے اعتبار سے ایک ناقص کارنامہ ہے۔ اس کا آغاز ایک قصے کے بیانیہ سے ہوتا ہے۔ منتہا سراپا پر ہوتا ہے اور متصوفانہ افکار میں بیانیہ کا سررشتہ گم ہوکر، ساری مثنوی میں ایک ابہام پیدا کر دیتا ہے۔ ممکن ہے کہ ایک صوفی منش بیانیہ کی اس ظاہری بے ربطی میں کوئی معنوی ربط تلاش کر سکے۔ لیکن ایک عام دلچسپی کی خاطر مطالعہ کرنے والے کی تشفی نہ تو "اس مثنوی" سے ہو سکے گی اور نہ کسی متصوفانہ توجیہ سے۔ اس کے باوجود یہ ایک واقعہ ہے کہ "خواب و خیال" بعض اچھے دیوانوں سے بھی زیادہ عرصہ تک زندہ رہے گی۔

"خواب و خیال" کے علاوہ، چند مثنویاں اور بھی گنائی جا سکتی ہیں، جو اسلوب کی خوبی اور تخئیل کی بلندی کے نقطۂ نظر سے دوسرے درجے کے غزل گو شعرا کے کلام کا مقابلہ بھی نہیں کر سکتیں لیکن ان کو اردو شاعری کی صف اول میں جگہ مل گئی ہے۔ مثال کے طور پہ سودا کی اکثر مثنویوں کو، میر کی چند اور مرزا شوق کی ایک آدھ مثنوی کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ میرزا علی لطف کی "نیرنگ عشق" کا بھی یہی حال ہے۔

یہ بات مخفی نہیں کہ غزل اور مثنوی، دو بالکل جداگانہ اصناف، بلکہ شاید متضاد اصناف ہیں۔ غزل مفرد اور منتشر خیالات کا مجموعہ ہوتی ہے اور مثنوی میں ربط خیال سب سے زیادہ اہم چیز ہے۔ غزل میں محض کنٹیل سے بھی کام چل سکتا ہے لیکن مثنوی نگار بغیر حقائق کے قدم آگے نہیں بڑھا سکتا۔ غزل میں تکرار اور تقلید کی کافی گنجائش ہے۔ لیکن مثنوی میں تکرار ناممکن ہے اور تقلید محدود۔ اس لئے وہ اردو مثنویاں بھی جو سنسکرت یا فارسی کا ترجمہ یا خلاصہ ہیں یا ان کی تقلید میں لکھی گئی ہیں اردو جامہ پہننے کے بعد، ایک نئی چیز بن گئی ہیں۔ ایک بلند پایہ غزل گو شاعر کا کلام، عوام کے لئے دلچسپی کا مواد کم رکھتا ہے۔ لیکن ایک بلند پایہ مثنوی سے بھی عوام کی تلقین اور تعلیم کا کام زیادہ آسانی سے لیا جا سکتا ہے۔ اس ایک خصوصیت کی وجہ سے مولانا حالی نے فارسی شاعری کو عرب کی شاعری پر بھی فوقیت دی تھی۔

یہ ایک واضح بات ہے کہ غزل اور مثنوی کے آرٹ میں بہت بڑا فرق ہے۔ غزل کا آرٹ غنائی اور ایمائی ہوتا ہے اور مثنوی کا بیانی اور توضیحی۔

مثنوی کی سب سے اہم خصوصیت جیسا کہ ظاہر ہے واقعات نگاری ہے۔ خواہ وہ فوق فطری ہوں، ورا فطری ہوں یا فطرت نما اور خواہ وہ رزمیہ ہوں، بزمیہ ہوں کہ اخلاقی اور فلسفیانہ۔ اردو میں عشقیہ قصے اور مہمات کی داستانیں مثنوی کا عام اور مقبول موضوع رہی ہیں۔ تاہم اس بنا پر مثنوی

کی اہمیت گھٹ نہیں جاتی۔ عشق اور مہمات کے قصے بھی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کا ایک معین مقصد ہوتا ہے۔ اور اگر بظاہر کوئی معین مقصد نہ بھی حاصل ہو، مسرت زائی اور حیرت و تعجب کو اکسانے کے کام سے یہ کسی طرح قاصر نہیں رہ سکتے اور یہ ادب کے مقاصد کے منجملہ ایک اہم مقصد ہے۔

مثنوی کے اسلوب اور طرز بیان میں شعری نزاکتوں اور ادبی لطافتوں کو استعمال کرنے کی بڑی گنجائش ہے۔ لیکن اس کا کمال، تسلسل اور ربط ہے شاعر کی توجہ، واقعات کے ارتقاء، ترتیب اور ربط میں زیادہ مصروف رہتی ہے۔ اس لئے بہترین مثنوی نگار بھی، خاص خاص مواقع کے سوا، صناعی پر کم وقت صرف کر سکتے ہیں۔

مثنوی کا ایک تیسرا وصف بیان اور اس کی توضیح اور تشریح ہے۔ اس مقام اور زمان کے علاوہ مواقع، مناظر اور نفسی کیفیات کی توضیحات بھی داخل ہیں۔ شاعر کی قوت متخیلہ ذرا بھی بیدار ہو، تو وہ اس ضمن میں، خاص لطف اور نزاکت پیدا کر سکتا ہے۔ بیانیہ، توضیحی اور نفسیاتی شاعری کے علاوہ غنائی اور طربیہ شاعری کے دلکش نمونے بھی وہ پیش کر سکتا ہے۔

مثنوی کی رفتار کے دوران میں بیسوں ڈرامائی مواقع پیدا ہو سکتے ہیں۔ اگر شاعر انھیں ذرا توجہ سے سرانجام کر سکے، اور مکالموں میں روزمرہ اور محاوروں کے ساتھ گفتار کے حسن ادا متکلم کی حیثیت کی رعایت

ملحوظ رکھے تو مثنوی میں ڈراما کا لطف بھی پیدا ہو جاتا ہے۔

ایک طویل کارنامہ ہونے کے اعتبار سے مثنوی میں شاعر کا تناظر اور احساس تناسب بھی معرض امتحان میں آجاتا ہے۔

سب سے آخری چیز مثنوی کا وہ مقصد ہے جس پر اس صنف کی ساری عمارت کھڑی کی جاتی ہے۔ بعض وقت مثنوی کا پایہ، اس کے مقصد کے اعتبار سے گھٹ یا بڑھ جاتا ہے۔ بہت کم مثنویاں ایسی لکھی گئی ہوں گی جن کا کوئی معین مقصد نہ ہو۔ یہ مقصد مذہبی، اخلاقی، معاشرتی، فلسفیانہ ہو سکتے ہیں یا محض فن کاری اس کا مقصد ہو سکتا ہے۔

اگر طویل مثنوی سرانجام کرنے میں، وقت کی تنگی حارج ہو تو چھوٹے چھوٹے مرقعے یا توضیحی (ڈسکرپٹیو) مثنویاں بھی لکھی جا سکتی ہیں۔ جو ادب میں اپنا خاص مقام رکھتی ہیں۔

انھیں اسباب کی بنا پر مثنوی کو اگر فن کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ ایک نہایت بسیط، مرکب اور کسی قدر پیچیدہ فن ہے جس کے تمام زاویوں پر روشنی ڈالنے کے باوجود، لطف اور خوبی کا ایک بڑا حصہ تجزیہ اور تشریح سے ماورا رہ جاتا ہے اور صرف ذوق اس کو پا سکتا ہے۔ یہ فن کار کا ذاتی عنصر ہوتا ہے اور یہی آرٹ ہے۔ اسی لئے ایک ترقی یافتہ تمدن اور معاشرہ کے لازمی ذہنی اور ذوقی لوازم کے طور پر، مربوط خیالی واقعات کے ارتقاء

دینے اور ایک معین مقصد پر ان کو اختتام تک پہنچانے کی جب تک قدر و منزلت رہے گی، مثنوی کی طرز شاعری کی اہمیت گھٹ نہیں سکتی۔ یہ اور بات ہے کہ کسی زمانے کے شاعر، اپنے تمدن اور معاشرہ کی پیچیدگیوں میں الجھ کر مختصر ادبی اصناف کی طرف زیادہ مائل ہو جائیں۔ لیکن جب کبھی ایک طویل اور بلند پایہ کارنامہ مثنوی کی صنف میں وجود میں آجائے، تو اس کے پڑھنے کے لئے مصروف سے مصروف زندگی میں بھی چند ساعتوں کی گنجائش ہمیشہ نکلتی رہے گی۔